واپسی کا سفر

(ناولٹ)

ازقلم:علیزا خان

ناشر

رائٹرز کلب پاکستان

0301-78867119 | https://writersclub.com.pk

☆☆☆

ایک چھوٹے سے گاؤں میں، جہاں صبح کی ہوا میں ناریل کے درختوں کی خوشبو گھلی رہتی تھی، مٹی کے گھروں کی چھتوں پر جلتی دیے کی لو، شام کے جھٹپٹے میں کسی خواب کی طرح ڈولتی تھی۔

اسی گاؤں کی پگڈنڈیوں پر، عورتیں گھاٹ پر بیٹھ کر ساڑھیاں دھوتیں، اور باتوں کے بیچ کبھی کسی کا نام، کسی کا خواب چھنک جاتا۔ بچے ننگے پاؤں کیچڑ میں دوڑتے، ان کی ہنسی میں زندگی کی سادہ خوشبو رچی ہوتی۔

اسی سادہ اور پُر معطر گاؤں میں ایک ٹھنڈی شام اُتری تھی۔ فضا میں مغرب کی اذانیں گونج رہی تھیں، جہاں وہ کچے صحن کے کونے میں بیٹھی اپنے پاؤں دھونے میں مصروف تھی۔

"بس کر ماہم... مغرب ہوگئی ہے، یوں کھلے آسمان تلے نہیں بیٹھتے مغرب کے وقت۔"

ماہم نے ہاتھوں کا پانی جھٹکتے ہوئے کوفت سے پیچھے مڑ کر دیکھا،

"بس کردو اماں، سارے وقت ہی اللہ کے ہوتے ہیں!"

اُس کے لہجے میں ضد تھی۔

"کم سے کم بال تو ڈھک لو!"

وہ اس کی ضد سے واقف تھیں اس لیے دوسری درخواست ڈالی۔

مگر وہ ویسے ہی ڈھیٹ بنی بیٹھی رہی، دوپٹہ شانہ پر دھرا رہا اور آنکھوں میں وہی ننھی سی شرارت اور ضد۔ اماں نے آہ بھری، جیسے جانتی ہوں کہ یہ لڑکی کبھی اپنی ضد سے پیچھے نہیں ہٹے گی،

پورا پونہ گھنٹہ لگا کر وہ اپنی جگہ سے اُٹھی۔ ابا بھی آ چکے تھے اور کھانا لگ گیا تھا۔ وہ کھانے کی چٹائی پر آ کر بیٹھی تو چہرہ اور ہاتھ پاؤں تازگی سے چمچما

رہے تھے، بلب کی روشنی اُس کے چہرے پر پڑی تو اُس کے خدوخال واضح ہوئے۔سونے جیسی گندمی رنگت اور چمکتی ہوئی سیاہ آنکھیں، جو بنگال کا سارا حُسن اپنے اندر سموئے ہوئے تھیں!

اُس نے سب پر ایک طائرانہ نظر ڈالی، سادہ لوح سے۔ابا تھکے ہوئے چہرے کے ساتھ خاموشی سے نوالے توڑ رہے تھے۔

اُس نے نظر پھیری تو اُس کی نگاہ اپنے نوعمر بھائی پر پڑی—وہ بھی اسی مظلومیت کا عکس تھا، وہی غربت، وہی سادگی، اور وہی عاجزی اور تھکن۔

ماہم کو بے تحاشا کوفت نے گھیر لیا۔اُس نے سب سے نگاہ ہٹا کر اپنے کھانے پر مرکوز کرنا چاہا، مگر دوپہر کی بچی ہوئی دال سبزی نے اُس کا جی ہی برا کر دیا۔

یہی غربت تھی جس سے اُسے نفرت تھی۔ یہی سادگی اور عاجزی تھی جس سے وہ دور بھاگتی تھی

لیکن اب بس تھی، وہ لائحہ عمل تیار کر چکی تھی۔اُسے بس اس ماحول سے دور جانا تھا—یہ وہ فیصلہ پہلے ہی کر چکی تھی۔

"ابا... اُس نے گلا کھنکار کر اُنہیں مخاطب کیا۔ابا نے نوالہ توڑتے ہوئے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

"اباوہ..."!!!وہ چند لمحے تذبذب کا شکار ہوئی، مگر ابا کو اپنی طرف دیکھتا پا کر ہمت جُٹا کر بولی،

"ابا، مجھے آگے پڑھنا ہے۔"

ابا نے ناسمجھی سے اُسے دیکھا، جیسے یہ بات اُن کے لیے اچانک اور غیر متوقع ہو.

" کیا پڑھنا ہے؟"اُنہوں نے ناسمجی سے سوال کیا، آنکھوں میں حیرت اور تشویش تھی۔

"مجھے دسویں سے آگے پڑھنا ہے، ابا... مجھے کالج جانا ہے۔"

اور یہ کالج کہاں ہے؟؟"اُنہوں نے اُسی حیرت اور ناسمجی سے سوال کیا، جیسے اُن کے لیے ابھی بھی یقین کرنا مشکل ہو۔"

آپ مجھے شہر میں چچا کے پاس بھیج دیں۔"

اُس نے کہا اور ڈھاکہ میں مقیم اپنے چچا کا حوالہ دیا۔

وہ چند لمحے خاموشی سے اُسے دیکھتے رہے، پھر آخری لقمہ لیتے ہوئے کھانا ختم کیا اور وہاں سے اٹھ کر چل دیے۔اُس نے غصے بھری بےبسی کے ساتھ اُنہیں جاتے دیکھا، مگر دل میں عزم کر لیا تھا کہ شہر تو وہ جائے گی۔

اور اس کے لئے اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔اگلے چند ہی دنوں میں چچا گاؤں آئے تھے ابا سے ملنے کے لئے، تو اس نے ان کے ساتھ جانے کی ضد باندھ لی۔ پہلے پہل تو ابا بہت تذبذب کا شکار ہوئے اور بہت اعتراض کیا۔ مگر جب چچا نے اس کی پڑھائی کا خرچ اٹھانے کا وعدہ کیا تو ابا کے پاس کوئی دلیل نہ بچی تھی کہ وہ اسے جانے سے روکیں۔بالآخر اس کی ضد کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے گئے۔اگلے ہی ہفتے وہ چچا کے ہمراہ ڈھاکا آ گئی تھی، ایک بڑے اور روشنیوں کے شہر میں۔وہاں اس کا ایک سرکاری کالج میں داخلہ کروا دیا گیا۔

یہاں اسے وہ زندگی ملی جس کا خواب اُس نے ہمیشہ دیکھا تھا۔

اٹھی ہوئی گردنوں کے ساتھ نفیس لباس میں ہنستے مسکراتے، قہقہے لگاتے لوگ۔

جہاں غربت نہیں تھی، اور اگر تھی بھی تو کم از کم لوگوں کے چہروں پر عیاں نہیں ہوتی تھی۔
ان کے چہرے تھکن زدہ اور عاجزی میں لپٹے نہیں ہوتے تھے۔ اور انہی پرفیکٹ، ہنستے مسکراتے لوگوں کی بھیڑ میں اسے ایک شخص ملا—
عبدالرحمن، ایک اُبھرتا ہوا سیاستدان۔

عبدالرحمن سے اس کی پہلی ملاقات کالج میں داخلے کے ایک ہفتے بعد ہوئی تھی۔ وہ ایک سماجی کارکن تھا، جو معاشرے کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرتا تھا۔
وہ اُس کالج کے لیے بھی فنڈ زدیتا تھا جہاں ماہم زیرِ تعلیم تھی۔ الیکشن قریب تھے، وہ کالج میں اکثر اسی سلسلے میں کمپین چلایا کرتا تھا۔ کالج میں ایک فنکشن کا اہتمام تھا جہاں نئے آنے والے طلبہ کا خیر مقدم کیا جا رہا تھا... اور وہاں عبدالرحمن بھی مدعو تھا۔

وہ جب اسٹیج پر آیا تو کتنی ہی نظریں اس پر اُٹھیں، کتنی ہی آنکھوں میں واضح رشک تھا۔
ماہم کی نگاہ جب اس پر اُٹھی تو ہٹنا ہی بھول گئی۔
وہ سوٹ بوٹ پہنے تازہ دم، پُراعتماد، چہرے پر ایک نرم مسکراہٹ لیے کھڑا تھا—وہی مسکراہٹ جو اس کی پہچان تھی۔

فنکشن کے آخری لمحات میں اُس نے ایک مختصر مگر پُراثر سا موٹیویشنل لیکچر دیا، جس نے نئے آنے والے طلبہ کے اندر جوش بھر دیا۔
جب وہ اسٹیج سے اُترا تو پورا ہال تالیوں سے گونج اُٹھا۔
کئی طلبا اس کی طرف بڑھے— کچھ autograph لینے، کچھ صرف اُس کے ساتھ ایک تصویر کے خواہش مند۔
اور وہ بھی صبر و محبت سے سب کی فرمائشیں پوری کر رہا تھا۔

ماہم کا سکتہ ٹوٹا تو اُس نے بھی ہمت جٹا کر اس کی طرف قدم بڑھائے۔

"جی؟" عبدالرحمٰن نے اُسے سوالیہ نظروں سے دیکھا،
کیونکہ نہ تو اُس کے ہاتھ میں کاغذ قلم تھا کہ autograph لیتی،
نہ ہی موبائل جس سے کوئی selfie لی جا سکتی۔

ماہم نے اُس کی نظروں سے گھبرا کر خشک لبوں پر زبان پھیری۔
"وہ...وہ ایک...وہ ایک سیلفی!"

عبدالرحمن نے مسکراتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھایا۔
ماہم نے ناسمجھی سے نظریں اُٹھائیں—
"موبائل تو نہیں ہے...!"
عبدالرحمن کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہوئی۔
اُس نے اپنے کوٹ کی جیب سے موبائل نکالا اور روانی میں ایک تصویر کلک کی۔

"جب یہ چاہیے ہوگی تو مجھ سے رابطہ کر لینا، میرا نمبر ایڈمن آفس کے بورڈ سے مل جائے گا۔"

نرمی سے اپنی بات مکمل کر کے وہ آگے بڑھ گیا،
جبکہ ماہم یوں ہی گنگ سی وہیں کھڑی رہ گئی۔
اگلے ہی دن وہ ایڈمن آفس کے بورڈ کے سامنے کھڑی تھی،
جہاں دیوار پر عبدالرحمن کی ایک بڑی سی فریم شدہ تصویر آویزاں تھی۔
وہاں چند سطروں میں اس کا تعارف درج تھا—
کالج کے لیے کی گئی اُس کی خدمات، فنڈ ریزنگ، اور آخر میں اُس کا رابطہ نمبر جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔

ماہم کی آنکھوں میں چمک اُتری، اُس نے جلدی سے ڈائری کے آخری صفحے پر وہ نمبر نوٹ کیا
اور اُسی خاموشی سے وہاں سے واپس چلی گئی۔

گھر پہنچ کر اُس نے دروازہ بند کیا،
اور دھڑکتے دل پر قابو پاتے ہوئے اُسے ایک ایس ایم ایس کیا۔

چند ہی لمحوں میں اُس کے موبائل کی اسکرین روشن ہوئی—
جواب آ گیا تھا۔

اور یہاں سے شروعات ہوئی اُس کہانی کی
جس نے ماہم کی پوری زندگی بدل کر رکھ دی۔

وہ ہرگزرتے دن کے ساتھ عبدالرحمن کے قریب آتی گئی۔
پہلے پہل اُسے ذرا سا خوف آتا تھا،
مگر عبدالرحمن کی نرمی، اُس کی شائستگی نے
وہ سارے خوف کہیں دور بھگا دیے۔

جب پہلی بار اُس نے اُس سے ملنے کی فرمائش کی،
تو وہ ذرا گھبرائی—
مگر پھر... ہامی بھر لی۔

☆☆☆☆

گھڑی پر دو بجنے کا گھنٹہ بجا۔
اُس نے جلدی سے آئینے میں خود پر ایک نگاہ ڈالی—
ہلکے آسمانی رنگ کے لباس میں اُس کی گندمی رنگت دمک رہی تھی۔
کاجل نے اُس کی غزالی آنکھوں کو کچھ اور حسین بنا دیا تھا۔
ہلکے میک اپ اور سادہ سی جیولری میں وہ بے حد جاذبِ نظر لگ رہی تھی۔

خود پر ایک آخری نگاہ ڈال کر اُس نے صوفے پر رکھی چادر اُٹھائی،
نرمی سے اوڑھی اور باہر نکل آئی۔

پیچھے سے چچی کی چبھتی ہوئی نظریں وہ بخوبی محسوس کر سکتی تھی،
مگر لاپرواہی سے چلتی ہوئی گلی کے کونے تک پہنچی—
جہاں سیاہ گاڑی اُس کے انتظار میں کھڑی تھی۔ اُس نے دہلیز پر قدم رکھا تو عبدالرحمن سامنے ہی صوفے پر بیٹھا تھا۔
عام سے لباس میں بھی وہ اُتنا ہی شاندار لگ رہا تھا۔
ماہم پر نظر پڑی تو اُس کی نگاہوں میں ستائش اُتری۔

"ویلکم، میڈم!"
اُس نے مسکراتے ہوئے خوش آمدید کہا۔

ماہم نے دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی۔
اور قدم قدم چلتی ہوئی اُس کے قریب آئی۔
اُس کے اشارے پر وہ سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

"پانی؟"
اُس نے نرمی سے پوچھا۔

"جی... تھوڑا سا۔"
ماہم نے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے جواب دیا۔
درحقیقت اُس کے گلے میں کانٹے چبھ رہے تھے۔

وہ اُٹھا، جگ سے پانی انڈیلا اور گلاس بھر کر اُس کے سامنے رکھ دیا۔ اُس نے ایک ہی سانس میں وہ سارا پانی خالی کر دیا۔

"اور چاہیے؟"
"نہیں... بس۔"
اُس نے مسکرانے کی کوشش کی مگر گھبراہٹ اُس کے چہرے سے عیاں تھی۔

"Be relax, یار..."
عبدالرحمن نے اپنی ازلی مسکراہٹ سے اُسے بہلایا،
اور اگلے چند لمحوں میں وہ واقعی پُرسکون ہو چکی تھی۔

یوں ہی چھوٹی چھوٹی باتوں میں دو گھنٹے گزر گئے۔
دونوں کے سامنے چائے کے کپ رکھے تھے۔
ماہم نے اپنا کپ اٹھاتے ہوئے ایک طائرانہ نظر سارے گھر پر ڈالی—

جونہی اُس کی نظر بائیں دیوار پر پڑی،
وہیں جم کر رہ گئی۔

بڑے سے فوٹو فریم میں عبدالرحمن کے ہمراہ
ایک سیاہ ساڑھی میں ملبوس لڑکی اور
پانچ، چھ سال کا بچہ مسکرا رہا تھا—
جس کی مسکراہٹ ہو بہو عبدالرحمن جیسی تھی۔

وہ جیسے کسی زلزلے کی زد میں آ گئی تھی۔
عبدالرحمن نے اُس کا سکتہ نوٹ کرتے ہوئے
اُس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا،
پھر ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

"یہ کون ہے؟"
ماہم نے مدھم آواز میں اُس کی طرف پلٹ کر پوچھا۔

"یہ"... اُس نے ذرا رُک کر کہا،
"یہ میری بیوی ہے—ہانیہ
اور یہ میرا اکلوتا بیٹا، ولید عبدالرحمن۔"

اُس کا لہجہ اتنا عام سا تھا کہ
ماہم کے دل کو بے اختیار ٹھیس پہنچی۔
"آپ نے کبھی بتایا نہیں کہ آپ شادی شدہ ہیں؟"
ماہم نے کپکپاتی آواز میں پوچھا۔

"آپ نے کبھی پوچھا ہی نہیں"...
اُس نے اُسی اعتماد سے جواب دیا۔

ماہم چپ ہو گئی۔

کمرے میں لمحہ بھر کی خاموشی پھیل گئی۔

" کیا ہو گیا، ماہم؟"
اُس نے چند لمحوں بعد نرمی سے پوچھا۔

" مجھے لگا میں آپ کو اچھی لگتی ہوں"...
ماہم نے نظریں اٹھائیں تو اُس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔

"اوہ، کم آن مہام، اس میں رونے والی کیا بات ہے، ڈیئر؟
اچھی لگتی ہو تو یہاں موجود ہونا"...
اُس نے اپنے پاس صوفے پر جگہ بناتے ہوئے کہا،
"اُٹھو، میرے پاس آؤ"...

مگر وہ یوں ہی بھیگی آنکھوں سے اُسے دیکھتی رہی۔

"اُٹھو، شاباش... یہاں آؤ"...
اس نے ذرا زور دیتے ہوئے کہا تو وہ خاموشی سے اس کے برابر میں جا بیٹھی۔ اس نے نرمی سے اس کا سر اپنے شانے پر رکھا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
بہت دیر بعد اس نے سر اٹھایا تو اس کا پورا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ ناک سرخ ہو چکی تھی۔ عبدالرحمن نے اُس کے آنسو نرمی سے صاف کیے اور اُسے پانی کا گلاس بھر کے دیا۔ پھر اُس کی طرف رخ کر کے سنجیدگی سے اُسے دیکھا۔
"اب میں جو کہہ رہا ہوں، اُسے غور سے سننا اور مجھے بیچ میں مت ٹوکنا۔"وہ خالی نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔

"میں نے تم سے کبھی نہیں کہا کہ میں شادی شدہ نہیں ہوں، نہ ہی کبھی کوئی وعدے یا دعوے کیے ہیں۔ اور میں نے تم سے یہ بھی کبھی نہیں کہا کہ میں تم سے شادی کروں گا۔ ہاں، تم مجھے اچھی لگتی ہو — جو بہت بار کہہ چکا ہوں۔ مگر میں شادی شدہ ہوں۔ مجھے سیاست میں آگے جانا ہے اور ہماری عوام کو وہی سیاستدان پسند آتے ہیں جو بس ایک شادی کریں اور ان کا ایک ہنستا بستا گھرانہ ہو۔ کیونکہ ان کی نظر میں جو اپنا گھر نہیں سنبھال سکتا وہ تخت کیا سنبھالے گا۔ اس لیے میں ایسا کوئی اسکینڈل برداشت نہیں کر سکتا۔"" لیکن میں تمہیں ایک آفر دیتا ہوں — مجھے قانون کی کچھ شقیں پڑھنی ہیں جن کے لیے مجھے ملک سے باہر جانا ہے۔ میں چند دن تک جا رہا ہوں، اسی لیے آج تمہیں بلایا تھا کہ ساتھ وقت گزار سکیں۔ انگلینڈ میں مجھے کوئی نہیں

جانتا۔وہاں میں آزادی سے جو چاہے کر سکتا ہوں ۔اگر تم میرا ساتھ چاہتی ہو تو چلو میرے ساتھ ۔۔۔ مجھے وہاں پانچ ماہ رہنا ہے،تب تک تم میرے ساتھ رہ سکتی ہو۔ جیسے بھی رہنا چاہو، میں تمہیں ہر ممکن خوشی دینے کی کوشش کروں گا۔لیکن واپس آ کر مجھے الیکشن لڑنا ہے،اس لیے یہ رشتہ آگے نہیں چل سکے گا۔ فیصلہ تمہارا ہوگا۔ میں کل کالج آؤں گا، آفس میں تمہارا انتظار کروں گا۔اگر جانا چاہتی ہو تو اپنے کچھ ضروری ڈاکومنٹس لے آنا، میں سارے کاغذات تیار کروا دوں گا۔اور اگر نہیں جانا چاہتی تو بھی آ کر ایک آخری الوداع ضرور کرنا۔"

اُس نے اپنی بات مکمل کر کے نرمی سے اُس کا ماتھا چوما۔

ماہم اُسی خاموشی سے اُٹھ کر باہر آئی اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔ ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کی اور اگلے چند ہی لمحوں میں وہ زناٹے بھرتی اُس کے اپارٹمنٹ سے بہت دور چل گئی۔

☆☆☆☆

ماہم نے وہ پوری رات جلتے انگاروں پر گزاری تھی،

جاگتی پلکوں میں بہت سے خواب ٹوٹے تھے۔گزرے دنوں کی پرتعیش زندگی اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک فلم کی طرح چل رہی تھی۔ جسے وہ کھو نہیں سکتی تھی ...

قدم قدم پر ایک گاڑی اُسے دستیاب رہی تھی۔

وہ مہنگے تحفے، ہر طرح کی مالی آزادی ... سب کچھ ہاتھ سے جاتا ہوا دکھ رہا تھا۔

پوری رات یوں ہی کشمکش میں گزری۔

☆☆☆☆

وہ صبح اُٹھی تو چہرے پر آنسو کے مٹے ہوئے نشانات تھے،

اور آنکھیں ساری رات جاگنے کی تھکن سے چُور تھیں۔وہ بستر سے اُٹھی، کپڑے تبدیل کیے اور آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی۔

آنکھوں کی سرخی چھپانے کے لیے اُن میں بھر بھر کر کاجل لگایا،

بے رونق لبوں پر ہلکا سا گلوس لگایا،

اور بالوں کو سیٹ کرتے ہوئے وہ کالج کے لیے تیار تھی۔اُس نے آفس کا دروازہ کھولا تو خلاف توقع ماہم پہلے سے وہاں موجود تھی۔

وہ حیرانی سے آگے بڑھا، ماہم کے لبوں پر مسکراہٹ اُبھری تو وہ اور بھی حیرانی میں مبتلا ہو گیا۔

ماہم نے فولڈر اُس کی طرف بڑھایا جس میں کاغذات تھے۔

"میں آپ کے ساتھ جانا چاہتی ہوں، چند دن کے لیے ہی سہی، چند لمحوں کے لیے ہی سہی۔"

اُس نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور آہستگی سے باہر چلی گئی۔

☆☆☆☆

اُس کے موبائل کی اسکرین روشن ہوئی، اسے میسج موصول ہوا تو اُس نے اپنے بیگ کی زِپ بند کی، جس میں کچھ ضروری سامان اُس نے پیک کرلیا تھا۔

کچھ لمحوں کے لیے وہ بے جان سی حالت میں بستر پر بیٹھی رہی۔

وہ جانتی تھی کہ یہ سب دروازے اب اُس پر ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں گے،

وہ دوبارہ کبھی ان سب کو نہیں دیکھ سکے گی۔

مگر لالچ نے اُسے اتنا اندھا کر دیا تھا کہ وہ کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتی تھی۔

اُس نے ساری سوچوں کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔

☆☆☆☆

اگلے دن وہ عبدالرحمن کے اپارٹمنٹ میں موجود تھی۔

اُس نے اُس سے صرف ایک مطالبہ کیا تھا کہ وہ اُس سے نکاح کر لے،

بھلے ہی جب وہ واپس آنا چاہے تو اُسے طلاق دے دے۔

مگر نکاح کے بغیر وہ اُس کے ساتھ نہیں رہ سکتی تھی۔

اور یہ مطالبہ عبدالرحمن نے بہت آسانی سے مان لیا تھا،

کیونکہ یہ اُس کے لیے کوئی مشکل نہیں تھا...

گواہ بھی اُس کے اپنے تھے اور قانون بھی اپنا تھا۔

نکاح کے ایجاب وقبول کے بعد، اُس نے بنگلہ دیش کی ہواؤں کو خیر آباد کہہ دیا تھا!

☆☆☆☆

وہ عبدالرحمن کے ہمراہ انگلینڈ آ گئی تھی۔ یہاں اُس نے ہر وہ عیش وآرام دیکھا جس کا خواب وہ ہمیشہ سے دیکھتی آئی تھی،

جس کے لیے اُس نے اپنے ماں باپ کو تیاگ دیا تھا،

اپنی نسوانیت کو رسوا کر دیا تھا اور اپنی عزت پامال کر دی تھی۔

اُس نے عبدالرحمن کے ہمراہ ہر وہ آزادی دیکھی،

ہر وہ لباس پہنا،

ہر وہ کھانا کھایا،

اور ہر وہ جگہ دیکھی جو اُس نے بس خوابوں میں دیکھی تھی۔

☆☆☆☆

مگر یہ مہینے تیزی سے گزر گئے

اور وہ دن آ پہنچا تھا جب اُنہیں واپس جانا تھا۔ وہ اپنے پی اے کو کال کر کے اُٹھا، تو ماہم جھکی نظروں سے اُس کے پاس آ کر بیٹھی تھی۔

" کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم اس رشتے کو یوں ہی "...

" نہیں، بالکل نہیں "...

عبدالرحمن نے سختی سے اُس کی بات کاٹ دی۔

"لیکن کیوں؟" اُس نے بھیگی پلکوں سے اُسے دیکھا۔

"بچوں جیسی باتیں مت کرو، ماہی ... یہ پہلے سے طے تھا، میں نے تمہیں سب صاف صاف بتا دیا تھا نا۔"

اُس کے لہجے میں ہلکی بے زاری تھی۔

ماہم کی نسوانیت کے پرخچے اڑ چکے تھے۔

اُس کی آنکھوں میں مرچیں سی بھرنے لگیں،

مگر بمشکل اُس نے آنسوؤں پر قابو پایا۔

girl…"goodmy like"That's

عبدالرحمن نے مسکراتے ہوئے اُسے گلے سے لگا لیا۔

☆☆☆☆

اگلے کئی دن وہ اُسی اداسی میں ڈوبی رہی۔

وہ سارا دن انگلینڈ کی سڑکیں ناپتی، اور شام پڑتے ہی جب اپنے اپارٹمنٹ میں آتی،

تو عبدالرحمن اُسی شدت سے اُس کے ذہن میں آتا تھا۔

اُس نے ڈرنک کرنا بھی شروع کر دیا تھا—

شاید یوں وہ اُسے بھول جاتی۔

☆☆☆☆

وہ ایک اُداس شام تھی...
عبدالرحمٰن کی یادیں اُس پر چھائی ہوئی تھیں۔
وہ اُس کے غم میں بے تحاشا نشہ کر چکی تھی۔

اُس کا سر چکر رہا تھا اور بدن کانپ رہا تھا۔
جب وہ اُٹھ کر کھڑی ہوئی تو لڑکھڑا گئی، اور اگلے ہی لمحے وہ اپنے پورے قد کے ساتھ زمین بوس ہو چکی تھی۔

وہاں موجود بار اٹینڈنٹ تیزی سے اُس کی جانب بڑھا۔
وہ نیم مدھوشی میں اُسے خود پر پانی ڈالتے ہوئے دیکھ رہی تھی،
مگر نشے نے اُس کے حواس ضبط کر لیے تھے۔

چند لمحوں بعد وہ مکمل طور پر ہوش و خرد سے بیگانہ ہو چکی تھی!

☆☆☆☆

اگلے دو دن وہ ہوش و بیہوشی کی ملی جولی کیفیت میں رہی۔
دو دن بعد جب اُسے مکمل ہوش آیا تو وہ ایک انجان جگہ پر تھی۔
کچھ حواس بحال ہوئے تو ہڑبڑا کر اُٹھ گئی۔

وہ کمرے سے اٹھ کر باہر آئی تو ایک شخص کچن میں موجود تھا اور کھانا بنا رہا تھا۔
اُس نے غور کیا تو وہی بار اٹینڈنٹ تھا جس بار میں وہ جاتی تھی۔
اُس نے ماہم کو باہر آتے دیکھا تو ہچکچاتے ہوئے اُس کی طرف آیا۔

"اُٹھ گئی آپ؟ اب کیسا محسوس کر رہی ہیں؟"

"میں یہاں کیسے آئی؟"
ماہم نے بے چینی سے سوال کیا۔

"میں لایا تھا آپ کو... دراصل آپ دو دن سے ہوش میں نہیں تھیں اور کوئی بھی آپ کو نہیں جانتا تھا۔ جب کچھ پتہ نہیں چلا تو میں آپ کو یہاں لے

آیا۔"
اُس نے جلدی سے صفائی پیش کی۔

"دو دن"...
ماہم جیسے ساکت میں آ گئی تھی۔

"آپ یہاں بالکل محفوظ ہیں، فکر مت کریں۔آپ اپنے گھر پر اطلاع دے سکتی ہیں"...
اُس نے اپنا موبائل ماہم کی طرف بڑھایا۔

ماہم کے ہونٹوں پر تلخ سی مسکراہٹ ابھری۔
"گھر... گھر ہی تو نہیں ہے"... اُس نے ٹھنڈی آہ بھری۔

وہ چند لمحے اُسے دیکھتا رہا، پھر خاموشی سے کچن کی جانب بڑھ گیا،
کھانا پلیٹس میں ڈال کر ٹرے میں رکھ دیا، اور میز پر رکھ کر کہا،
"آ جائیں، پہلے کچھ کھا لیں۔آپ کو ضرورت ہے۔"

ماہم کی آنکھوں میں تشکر ابھرا۔اور پھر کھانے کے دوران اُس نے اپنی گزری زندگی کی پوری داستان سنا دی... ماہم نے اپنی کہانی مکمل کی تو اُس نے گلا کھنگارتے ہوئے اُسے مخاطب کیا۔
"میں یہاں اکیلا رہتا ہوں۔تین ماہ بعد میری شادی ہے۔میں پاکستان سے تعلق رکھتا ہوں۔یہ میرا آخری کنٹریکٹ ہے، اس کے بعد میں پاکستان چلا جاؤں گا۔آپ چاہیں تو یہاں رہ سکتی ہیں۔اگر چاہیں تو"... اُس نے "چاہیں" پر زور دیا۔

ماہم چپ سی ہو گئی، پھر اپنی تنہائی یاد آئی تو اُس نے اگلے ہی لمحے فیصلہ سنا دیا۔
"ٹھیک ہے... میں رہنا چاہوں گی، مگر کچھ شرعی تقاضے ہیں۔" اُس نے اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"شادی؟" اُس نے سوال کیا۔

"صرف نکاح... جب پاکستان جاؤ گے تو مجھے چھوڑ دینا۔"

ماہم نے بے رحمی سے مطالبہ کیا، جیسے وہ اپنی نہیں کسی اور کی بات کر رہی ہو

ٹھیک ہے...

اُس نے بھی ایک لمحے میں قبول کر لیا تھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" اُس نے ماہم سے پوچھا تو وہ بے اختیار ہنس پڑی۔

"ماہم!"

"اور تمہارا؟"

"اسفر احسن!" وہ بھی ہنس پڑا۔

اسی دن چند گواہوں کی موجودگی میں ان کا نکاح ہوا۔

اور اگلے ہی دن سے ماہم نے اُلٹے دن گننا شروع کر دیے۔

وہ جانتی تھی یہ وقت بھی جلد گزر جائے گا، اور وہ ایک بار پھر تنہا ہو گی۔

اور واقعی، وقت پر لگا کر اُڑ گیا۔

☆☆☆☆

وہ دن آ پہنچا جب اسفر کو واپس جانا تھا۔

ماہم خاموشی سے اُس کا سامان پیک کر رہی تھی،

جب وہ ماہم کے پاس آیا اور نرمی سے اُس کا ہاتھ پکڑا۔

"ماہی... یہ تمہارا پاسپورٹ اور ٹکٹ ہے۔ میرے ساتھ پاکستان چلو، وہاں میرے کچھ تعلقات ہیں، تمہیں ایک اچھی نوکری مل جائے گی... اور میں بھی تمہاری مدد کے لیے موجود ہوں گا۔"

ماہم کی آنکھوں میں تشکر ابھرا۔

اُس نے بھیگی پلکوں کے ساتھ اُسے تھاما اور اگلے سفر کی تیاری شروع کر دی۔

☆☆☆☆

صبح کا سورج طلوع ہوا تو اس کی روشنی ہر جگہ پہنچ گئی۔ کراچی کی سب سے کچی بستی کی گلیوں میں بھی سورج اسی آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ گلی کے

کونے پر ایک بھوری لکڑی والا دروازہ کھلا تھا۔ اگر آپ اس دروازے سے جھانکیں تو سامنے والے کمرے میں ماہم آئینے کے سامنے کھڑی اپنے بال سنوار رہی تھی — اس کے بالوں میں ہلکی سی چاندی اتر آئی تھی۔ پانچ برس تیزی سے بیت چکے تھے اور اُن کے گہرے نشانات اس پر واضح تھے۔

اس کی غزالی آنکھوں کی چمک مدھم پڑ چکی تھی۔ چمکتی رنگت میں بھی زردی گھلی ہوئی تھی اور لباس دھل دھل کر پرانا ہو چکا تھا۔ خود کو آئینے میں دیکھتے ہوئے اس کی زندگی اس کے سامنے ایک فلم کی مانند چل رہی تھی — جہاں وہ نت نئے کپڑوں میں ابا کے آنگن میں چہچہایا کرتی تھی۔ مگر اسے بنگال کی اُس غریب اور پرانے گاؤں کی یادیں ناپسند تھیں۔ اب وہ پاکستان کے سب سے کچے علاقے کے ایک چھوٹے سے محلے کی تنگ گلی میں، دو کمروں کے گھر میں مقیم تھی۔

یہاں آ کر اس نے ایک عام سے دکاندار سے شادی کر لی تھی، جس نے اُس سے اس کا ماضی نہیں پوچھا۔ خاموشی سے اُس نے اسے اپنی زوجیت میں لے لیا — جو ماہم کے لیے بہت بڑی نعمت تھی۔ اس کی لالچ نے اسے کہاں کا کہاں پہنچا دیا تھا...

اُس کے خیالوں کا تسلسل ٹوٹا — اس کا بڑا بیٹا گلی میں کھیلتے ہوئے گر پڑا تھا اور چیختے ہوئے اسے پکار رہا تھا۔ ماہم نے جلدی سے بال جوڑے میں باندھے سر پر ڈوپٹہ رکھا اور ننگے پاؤں باہر نکلی۔ اس کا سارا دن اسی مصروفیت میں نکل جاتا تھا — گھر کے کام نپٹاتے، بچوں کو سنبھالتے، وہ اپنا آپ تو بھول ہی گئی تھی۔ بس کبھی کبھار رات کی تنہائی میں، کروٹیں بدلتے ہوئے، اسے اپنی نادانیاں یاد آتی تھیں اور ایک نہ ختم ہونے والا پچھتاوا اسے گھیر لیتا تھا۔

طاقت اور لالچ کی ہوس نے اسے اتنا اندھا کر دیا تھا کہ وہ اپنا سب کچھ آگ میں جھونک چکی تھی۔

آج رات بھی گزری یادیں اُس پر یوں ہی حملہ آور ہوئی تھیں...
اس نے پاس پڑے بچوں اور شوہر پر ایک نگاہ ڈالی، خود پر قابو پاتے ہوئے اپنے آنسو پونچھے اور کمرے کی وہ واحد زیرو بلب کی روشنی بھی بجھا دی۔

اب ہر طرف اندھیرا تھا — صرف اندھیرا!!!!!!!

☆☆☆☆

تمت بالخیر